ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
ارشد محمود
لیکچرر، شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج چکوال

ابتدائی ترقی پسند ناول اور عصریت

When an artist encompasses the representative intellectual tendencies in his creations, he, in fact, reflects the episteme and determining the reality of present age. So the progressive writers maintained their uniqueness in a way that they adhered to their particular era and expressed the zeitgeist.

Progressive writers strengthened the tradition of portraying the inner self boldly. Hence they brought literature close to the concrete facts. Among the pioneer and representative progressive novelists, Sajjad Zaheer, Ismatchughtai, krishanchander are very prominent. These novelists observed the material life very closely and revealed its inner feelings. They selected and touched such sensitive themes of human life which were prohibited earlier.

They dreamt of the humanitarian society free from class conflict, gender discrimination, social exploitation, cultural chaos, sense of slavery and colonial tyranny. To establish a society based upon equality envisaged by the communist manifesto was their common subject. Progressive writers seem to represent their age by reflecting the contemporary consciousness.

روسی انقلاب کے بعد مارکسی نقطۂ نظر کو دنیا بھر میں مقبولیت ملی۔ تمام اہم تحریکات نے مارکسیت کو بطور منشور اپنایا۔ دنیا اشتراکیت کی طرف راغب ہوئی سو ہندوستان میں بھی مخصوص سامراجی تمدنی فضا کے باعث اشتراکی نظریات تیزی سے قبولیت حاصل کرنے لگے۔ ادیب بالعموم اپنے ماحول اور تمدنی فضا سے متاثر ہوتے ہیں۔ تخلیق کار اپنے سماجی حالات سے بصیرت حاصل کرتا ہے اور ہم عصر اقدار اور خیالات پر تنقید کر کے غالب فکری رجحان کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ عمل ناول نگار کے ہاں زیادہ واضح ہوتا ہے کیونکہ اسے مکمل زندگی کا نقشہ پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ امکان بہت کم ہوتا ہے کہ ناول نگار کے تصورات اپنے عہد کی تسلیم شدہ حقیقتوں اور تصورات سے متصادم ہوں گے بلکہ وہ اپنے عہد کے نمایاں رجحانات اور رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول نگار کا سماجی شعور اپنے سماج کی تاریخ و تہذیب میں پیوست ہوتا ہے اور وہ

تاریخ کے نتائج سے مستقبل کے امکانات کی تلاش کرتا ہے۔ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد برصغیر کے تمام اہم لکھنے والے ترقی پسند افکار سے متاثر ہوئے۔ ترقی پسند افکار کے فروغ اور ناول نگاروں کے ہاں ان کی قبولیت کا احاطہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ہندوستان میں بھی ناول نگاروں کا سیاسی جدوجہد کو پیش نہ کر کے افراد کی ذہنی آسودگی اور اشتراکیت کی طرف بڑھتے ہوئے رجحان کو پیش کرنا بھی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دور کے ناول نگار اپنے عہد کے غالب فکری رجحانات کو ظاہر کر رہے تھے۔ کیونکہ دنیا کے حالات کچھ ایسے تھے جس کی وجہ سے قومی مسائل پس منظر میں چلے گئے تھے۔[1]

دنیا بھر کی نا آسودگی، معاشی بحران، اقتصادی کساد بازاری، غیر یقینی مستقبل، دو عظیم جنگوں کے درمیان کی سراسیمگی نے ایک بے چینی کی حالت پیدا کر رکھی تھی۔ دنیا بھر میں اشتراکیت کی طرف رغبت کا رجحان بڑھ رہا تھا۔اسی عہد کے ہندوستان کے اہم ناول نگار مارکسیت طرف مائل نظر آتے ہیں۔ جب فن کار اپنے عہد کے نمائندہ فکری رجحانات کو اپنی تحریر میں لے آتا ہے تو گویا وہ اپنی عصریت کا اظہار کر رہا ہوتا۔ اس اعتبار سے ترقی پسند تخلیق کار انفرادیت کے حامل ہیں کہ وہ اپنے عہد کی عصریت سے منسلک تھے اور اس کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے ادیبوں میں بلا جھجک اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے رجحان کو تقویت دی۔تحریک سے وابستہ تخلیق کاروں نے میسر آزادی کا ہر رخ پہ استعمال کیا اور باغیانہ اور انقلابی رجحان نے تحریک سے غیر وابستہ ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کی بطور مجموعی روش بدل دی اور اردو ادب عالمی ادب کے رجحانات سے متاثر بھی ہوا اور اس کی عکاسی بھی کرنے لگا۔تحریک کی نمائندہ اور امتیازی خصوصیت حقیقت نگاری ہے۔حقیقت نگاری کا یہ رجحان اس دور کے اردو ناولوں میں بطور خاص ملتا ہے جو ما قبل کے ناولوں میں موجود نہیں تھا۔

دراصل حقیقت نگاری کی جدید لہر سائنسی علوم کی مرہون منت ہے۔ جدید سائنس نے عقلیت پسندی کو فروغ دیا جس سے تشکیک کی فضا پیدا ہوئی۔ سائنسی شعور نے ہی واقعات اور اشیا کی اصل ماہیت کا فہم پیدا کیا اور ان کے اظہار میں ماورائیت سے ورا حقیقت نگاری کا انداز اپنایا۔ کائنات اور اس کے مظاہر سے نئے مادی رشتوں کی تشکیل نے ایک سطح کی قنوطیت کو بھی جنم دیا۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ناول نگاروں کی تحریروں میں اس قنوطیت کے واضح اثرات ملتے ہیں۔

ناول ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں کسی بھی عہد کی عکاسی اس عہد کے تاریخی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی سیاق کے حوالے سے کی جا سکتی ہے۔ جبکہ حقیقت نگاری ناول کے موضوع قصہ کی اساس سمجھنے میں معاون ہوتی ہے۔ترقی پسند تحریک کا زیادہ اثر افسانہ اور نظم پر رہا۔ افسانہ بطور خاص ناول سے زیادہ مقبول ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ افسانہ فوری سرایت کر جانے والی اور مؤثر صنف سخن ہے۔ اسی لیے ترقی پسند افسانے نے صحت مند روایات کے ساتھ نئے سماجی موضوعات کو اپنے اندر سمویا اور مقصدیت کا اظہار کھل کر کیا اور جلد قبولیت حاصل کر لی۔ جدید تجربات اور تصورات کا اظہار

ناول میں بھی ہوا لیکن ناول کو افسانے جتنی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ البتہ ناول میں جنگ، سماجی استحصال، طبقاتی تفاوت، معاشی تضادات اور سامراج مخالف رویوں وغیرہ کا اظہار بخوبی ہوا۔ بقول ڈاکٹر عثمان فاروق:

> مارکس ازم اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے جدید سائنسی علوم کی روشنی میں اس عہد کے ناول نگار نے بھی ان محدود امکانات سے اپنے آپ کو باہر نکال لیا۔ جس میں اس صدی کی ابتدائی دہائیوں میں کہانی کا رالجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ۔۔ بلاشبہ ترقی پسند تحریک کے ناول نے انسان کی مادی زندگی کو قریب سے اور بہ نظر غائر دیکھا ہے اور وجود کے مخفی حصوں کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔ اس ناول نے جہاں مہم جوئی اور ایڈونچر کی چھان بین کی ہے وہاں واردات دروں کا بھی معائنہ کیا ہے۔[۲]

ترقی پسند تحریک کی امتیازی خصوصیت اس کی حقیقت نگاری ہے۔ ترقی پسند لکھنے والوں کی زیادہ توجہ افسانے پر رہی لیکن اردو ناول بھی نئے سماجی و معاشی پس منظر میں ان کی خصوصی توجہ کا مستحق ٹھہرا۔ زندگی اور اس کے ہمہ جہت پہلوؤں کی طرف ترقی پسند مصنفین کا رویہ زیادہ معروضی، بے باک اور حقیقت پسندانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ناول نگاروں میں سے ہر ایک کا رجحان منفرد اور طرز فکر و احساس جدا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان ناول نگاروں کا سجاد ظہیر کے استثنا کے ساتھ، تعلق متوسط طبقہ سے تھا۔ اس لیے یہ اپنے طبقے کی کہنگی، فرسودہ روایات، رسوم و رواج، بوجھ بن چکی اخلاقی اقدار کے خلاف احتجاج کی علامت بن کر ابھرے۔ ترقی پسند تحریک کا ایک اور مثبت پہلو یہ تھا کہ پہلی بار اردو ادب اشراف طبقات سے نکل کر عام طبقات کی رسائی میں آیا اور عام طبقات کی زندگی کو بھی موضوع بنانے لگا۔ ان مصنفین نے سماج میں موجود طبقاتی آویزش کو موضوع بنایا۔ جدید نفسیات کے ذریعے ناول کو نئے نئے موضوعات سے کشادہ دامن کیا۔ ترقی پسند ناول نے مثالیت پسندی اور تصور پرستی کی شکستہ دیوار کے سائے میں بیٹھے کرداروں کو حقیقت پسندی کی سنگلاخ زمینوں کا باسی کر دیا۔ اب یہ کردار فرسودہ اور کہنہ سماجی و اخلاقی اقدار کے خلاف بغاوت اور آزادی، انصاف، مساوات، طبقاتی تقسیم کی نفی اور انسان دوستی جیسے تصورات کے حامی کے روپ میں سامنے آئے۔

ترقی پسند ناول نگاروں کی اولین اور نمائندہ فہرست میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، کرشن چندر اور عزیز احمد کا نام نمایاں ہے۔ ترقی پسند ناول نے انسان کی مادی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس کے وجود کے داخلی احساسات کی نقاب کشائی بھی کی ہے۔ وہی ادب پر تاثیر ہوتا ہے جس میں اس کے تخلیقی عہد کا سماجی شعور جھلکتا ہو۔ ترقی پسند مصنفین نے اپنی عصریت کو شناخت کیا اور اس کا بھرپور اظہار ان کے تخلیقی ادب سے بھی جھلکتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کو بالعموم اردو کا پہلا ترقی پسند ناول نگار سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ عزیز احمد کا خیال ہے کہ ''قاضی عبدالغفار کا 'لیلہ کے خطوط' پہلا ترقی پسند ناول ہے''[۳] اسی خیال کے حامی ڈاکٹر سہیل بخاری بھی ہیں۔ ان کے بقول:

> قاضی عبدالغفار اردو ناول کے پہلے ترقی پسند ناول نگار ہیں۔ انھوں نے انگریزی ناولوں کے اس طرز پر جو اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلستان اور فرانس میں عام تھا، دو ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'روز نامچہ یا مجنوں کی

ڈائری' تحریر کیے ہیں۔۔۔ اردو ناول قاضی صاحب کی کوشش سے پہلی بار اس طرز سے واقف ہوا۔[۴]

ناول کا قصہ اپنی انشاپردازی کے حوالے سے رومانویت کے پہلو لیے ہوئے ہیں۔ صرف موضوع قصہ کے سبب اسے ناقدین نے ترقی پسند ناول شمار کیا ہے۔ گو کہ خود مصنف کا منشا یہ ہے کہ اسے ناول نہ کہا جائے لیکن ان مکتوب کی ترتیب اور واقعات قصہ اسے ناول بنا دیتے ہیں۔ البتہ موضوع میں ایسی گنجائش موجود ہے کہ کردار مثالیت پسندی کا شکار ہو رہے ہیں۔ مثلاً طوائف کا عاشق ہر حال میں اس طوائف کو اپنانا چاہتا ہے۔ یہیں سے معلوم ہوا کہ ترقی پسند مصنفین کا تصور انسان بھی مثالی ہے۔ ناول کی زبان اور اس کا تخیل اس میں ایک خاص رومانی فضا کا تاثر قائم کر دیتے ہیں۔ فقط اس کا موضوع چونکہ مروج سماجی اقدار سے بغاوت ہے اس لیے اسے ترقی پسند ناول گردانا گیا۔ اپنے عصر سے یہ ناول فقط اتنا ہم آہنگ ہے کہ مصنف نے متوسط طبقات کی منافقت، اعلیٰ طبقات کی مفاد پرستی اور سماجی اخلاقی حدود و قیود کی جکڑ بندیوں کو موضوع بنایا ہے۔

اردو ناول نگاری میں جس ناول نے ایک نیا رخ متعین کرنے اور جدید علوم کی رہنمائی میں عصریت کو بیان کرنے کا ڈول ڈالا وہ صحیح معنوں میں سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ہے۔ موضوعات کے تنوع، سیاسی، سماجی تفریق، سامراجی ہتھکنڈوں اور نفسیاتی عوامل کا امتزاج اس ناول میں ملتا ہے۔ یہ ناول لندن میں ہی لکھا گیا تھا۔ اس کے کردار ہندوستان کے خوشحال گھرانوں کے افراد ہیں جو لندن میں بغرض اعلیٰ تعلیم موجود ہیں۔ یہ تمام کردار مہذب ہیں مغربی جدیدیت کے ہندوستانی نمائندے ہیں۔ سامراجی ناانصافیاں ان کا موضوع ضرور بنتی ہیں لیکن یہ ان کے خلاف مزاحم نہیں ہیں۔ جدید سائنسی علوم نے پرانے اعتقادات ختم کر دیے ہیں اور یہ تمام کردار تشکیک کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ناول کی فضا جدید لندن سے متاثر ہے۔ اس کے موضوع میں خالص ترقی پسند نظریات کا دخل کم ہے۔ سوائے اس کے کہ کردار اس ذہنی کشمکش کا شکار ہیں کہ وہ ہندوستان میں نو آبادیاتی گردانے جاتے ہیں جبکہ لندن کی اس فضا میں انھیں دیگر افراد کے ساتھ برابری کے حقوق حاصل ہیں ایسے حقوق انگریز سامراج کے ساتھ خود اپنے وطن بھارت میں انھیں کیوں حاصل نہیں؟ یہی ذہنی کشمکش ان سے تقریریں تو بہت اچھی کرا لیتی ہے مگر عمل کی قوت سے یہ سب کردار محروم ہیں۔ دراصل ان میں سے بیشتر کا تعلق ایسے طبقات سے تھا جو سامراج کی پشت پناہی سے وجود میں آئے تھے۔ اس لیے وہ اپنے مربیوں کے خلاف مزاحمت کا خیال تک نہیں لا سکتے تھے۔ یہ کردار عمل سے زیادہ فکر پر یقین رکھتے ہیں۔ تشکیک کی فضا نے زندگی کی ناپائیداری کا احساس گہرا کر دیا تھا۔ دو عظیم جنگوں کے درمیان کے وقفے نے اس ناپائیداری کے رجحان کو تقویت دی تھی۔ اس لیے ان کرداروں کی فکری ساخت بھی ژولیدگی کا شکار ہے۔ کرداروں کی تقاریر نما مکالموں میں اشتراکی پروپیگنڈہ خوب کیا گیا ہے۔ ناول البتہ اشتراکی فکر کے بجائے مغربی جدیدیت سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے۔ تمام کردار انسانی آزادی اور مساوات کے قائل ہیں اور خود کو ہر مرحلہ پر مہذب ثابت کرنے کی کوشش میں مبتلا ہیں۔ یہ ناول ہندوستانی طلبہ کے متعلق ہے جن کی زندگیاں یورپ کی آزاد فضا میں گذر رہی ہیں۔ ناول کے آغاز میں انگریز

سامراج اور ہندوستانی نوآبادیات کے مابین موجود سیاسی اور معاشی رشتوں پر بحث ہے۔ گو کہ اس کے کردار لندن کی رنگین فضا کا حصہ بن چکے ہیں لیکن ان کے دلوں کی دھڑکنیں عام ہندوستانی مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں کے ساتھ دھڑکتی ہیں۔ یہ کردار مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نسل اور قوم بھی مختلف ہے لیکن یہ سب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آئے ہیں اور انھیں ہندوستان کا غلام ہونا کھلتا ہے اور یہ آزادی کے طلب گار ہیں اور ان کی آزادی کی طلب میں شدت اس باعث بھی زیادہ ہے کہ یورپ کی آزاد فضا انھیں متاثر کر رہی ہے۔ ناول نگار کا سیاسی شعور واضح ہے۔ وہ ہندوستان کی غلامی کو اس تاریخی عمل میں رکھ کر دیکھ رہے ہیں کہ جہاں مزاحمت ختم ہو چکی ہے اور لوگ ذاتی مفادات کے حصول کے لیے کچھ بھی کہنے اور کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اعظم اور راؤ کے مکالمے میں مصنف نے اپنے سیاسی شعور کا اظہار کیا ہے:

> ہم کالے آدمیوں کی جان کیڑے مکوڑوں کے برابر ہے اور قصور ضرور ہمارا ہی ہوگا! ہم ہندوستانی اسی لائق ہیں ۔ کمینے، ذلیل، بزدل، جوتا کھاتے ہیں مگر انگریزوں کی خوشامد سے باز نہیں آتے۔۔۔ خیال تو کرو ۳۵ کروڑ انسان اور ایک لاکھ سے بھی کم انگریز ان پر مزے سے حکومت کرتے ہیں۔۔۔ ہندوستان میں ذلیل سے ذلیل انگریز کا رتبہ بڑے سے بڑے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے۔ یہاں انگلستان میں چاہے انگریز مرد ہمارے جوتے صاف کرے اور انگریز لڑکیاں ہم سے محبت کریں مگر سویز کے اس پار تو ہم سب 'کالا لوگ' 'نیٹوز' غلاموں سے بدتر سمجھے جاتے ہیں۔[۵]

ناول کا کردار 'راؤ' ہندوستانی سماج کی حالت پر طنز کرتا ہے گویا وہ ناراض نسل کا نمائندہ کردار ہے۔ ناول کے کردار اپنے عصر کے نمائندہ ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے جدید ذہن کی پیداوار ہیں اور پرانی اقدار سے انحراف کر کے جدید اقدار کو اپنا رہے ہیں۔ البتہ ان کا بنیادی مسئلہ عمل کے بجائے فکر برقرار رہتا ہے۔ ان کی اقدار مستقل اور پائیدار ہیں اور نہ ہی کوئی اور رشتہ مستقل یا پائیدار ہے۔ گویا وہ محبت میں بھی شدت نہیں رکھتے اور نہ ہی نفرت انھیں کسی باغیانہ جذبے پر ابھارتی ہے۔ ڈاکٹر سید علی حیدر ناول کی عصریت کو موضوع بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' لندن کی ایک رات'' میں اس نا آسودگی کا احساس ملتا ہے جو نوجوانوں کے دلوں میں پرورش پا رہی تھی۔۔۔ یہ ناول اپنے دور کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالت کا عکاس ہے اور ہندوستانی زندگی کے مختلف رجحانات، اہم مسائل اور نوجوان ذہن کے جذبات و نفسیات کا ترجمان ہے۔[۶]

ناول نگار نے ہندوستانی سماج کا معروضیت کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور ان ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنی کشمکش کی عکاسی کی ہے جو انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے تھے اور انھیں وطن کی غلامی کا احساس ستاتا ہے۔ ان میں ایسے بھی کردار ہیں جو یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ انگریز نوآبادکار کے خلاف مزاحمت بے کار ہے اور وہ بظاہر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نظام کا حصہ بن جانے پر آمادہ ہیں مثلاً عارف کا کردار جو ابھی آئی۔ سی۔ ایس امتحان کا امیدوار ہے مگر وہ ابھی

سے یہ سمجھتا ہے کہ حاکموں کا ساتھ دینا چاہیے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی مطالبہ آزادی پر گولی مارنے کو اپنے سرکاری فرائض منصبی میں شمار کرتا ہے۔ گویا اس کا ذہن نو آبادکار کے سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ لگا کھاتا ہے اور وہ خود کو نو آبادکار کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔

اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستان میں پیدا آزادی کی لہر، اس عہد کی سیاسی زندگی، معاشرتی اقدار اور بعض عصری تحریکات کا احوال ملتا ہے۔ انگلستان کی آزادفضا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے تضاد نے وہاں مقیم طلبا کے ذہنوں کو منتشر کر رکھا ہے۔ اس کے اکثر کردار عصری مسائل پر پائیدار سوچ سے عاری ہیں۔ نعیم جیسے کردار اسی لیے انفعالی کیفیت کا شکار ہیں کہ وہ ذہنی انتشار میں گھرے ہوئے ہیں اور راؤ کا کردار منفی عمل پر آمادہ ہے۔ ناول کے کردار جگہ جگہ انگلستان کی تہذیبی زندگی سے اپنے وطن کی تہذیبی زندگی کا موازنہ کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کے لہجے اکثر معذرت خواہانہ ہوتے ہیں۔ ناول کا موضوع فقط ہندوستان کی عصری صورتحال نہیں بلکہ اشتراکی فلسفہ بھی زیر بحث رہتا ہے۔ مثلاً احسان کا کردار جو انقلابی ہے، اشتراکی ہے اور وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے اسے سامراج سے نفرت ہے اور چاہتا ہے کہ انگلستان میں مقیم ہندوستانی طلبہ یہاں کی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جائیں بلکہ ہندوستان کے زوال کو مدِ نظر رکھیں اور واپس جا کر آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ وہ اشتراکی خیالات کا مالک ہے اور اس کے خیال میں صرف نو آبادکار ہی نہیں بلکہ نام نہاد اعلیٰ طبقات جو انگریز سامراج کے نمک خوار ہیں، وہ بھی ہندوستان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں:

> تم سب کے سب رئیس، بنئے، مہاجن، بیرسٹر، وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر، سرکاری نوکر جونک کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی۔ کسی نہ کسی دن تو ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔[۷]

سجاد ظہیر کا سیاسی شعور واضح ہے۔ ان کا تہذیبی شعور دو تہذیبوں کے مابین موجود خلیج کی درست نشاندہی کرتا ہے۔ ہندوستان کی عصری صورتحال ہر لمحہ ناول سے متواتر منعکس ہوتی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی خوب کی گئی ہے۔ ناول سے اس عہد کے ہندوستان کی تہذیبی زندگی کے رجحانات اور دیگر نفسیاتی عوامل اور حالات و کیفیات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ''لندن کی ایک رات'' کا موضوع کوئی ایک تہذیب یا ایک شہر کا ماحول نہیں ہے بلکہ یہ ناول معاشرتی سطح پر پیدا ہونے والے مختلف کرداروں کے ذہنوں میں ابھرتے سوالوں کا احوال ہے۔ ناول کی عصریت وہ شعور ہے جو غلام ہند میں آزادی کی حرارت پیدا کر رہا ہے اور ایسے کرداروں کے سماجی شعور سے بھی فنکار آگاہ کرتا ہے جو حالات میں تبدیلی کی جھلک نہیں دیکھ پا رہے۔ ناول میں کردار اپنے خیالات کے اظہار کے لیے لمبے لمبے مکالموں کا سہارا لیتے ہیں جس سے ناول کا قصہ مجروح ہوتا ہے۔ سوفی اعتبار سے نئے تجربات کا حامل ہونے کے باوجود قصہ کے بنیادی سقم ناول میں موجود ہیں۔

''لندن کی ایک رات'' کے بعد سے کافی عرصہ تک کوئی ایسا ناول نہیں آیا جو فنی اعتبار سے بہتر ہو۔ قریباً سات برس بعد ۱۹۴۳ء میں کرشن چندر کا ناول ''شکست'' سامنے آیا:

> یہ ناول ایک لحاظ سے ''لندن کی ایک رات'' میں سامنے آنے والے فکری رویّوں کی توسیع نظر آتا ہے۔ یہاں کی رومانی فضاؤں کے باوجود ہر جگہ اسی ذہنی انتشار کا پرتو ہے جو اس عہد کا ایک عام عطیہ ہے۔[۸]

''شکست'' کے بارے میں متضاد آراء پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً عزیز احمد کی رائے ہے ''کم سے کم ایک اردو ناول ترقی پسند تحریک نے ایسا پیدا کیا ہے جو اردو زبان کے بہترین ناولوں میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔ یہ ناول کرشن چندر کا 'شکست' ہے۔''[۹] جب کہ اس سے ایک بالکل ہی متضاد رائے ڈاکٹر احسن فاروقی کی ہے ''ان (کرشن چندر) کی پہلی ناول ''شکست'' اس میدان میں ان کی صاف شکست کی مثال ہے۔''[۱۰] اس بیان کی وجہ بیان کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں ''ناول مقصد لے کر چلتی ہے جو کہیں کہیں مکالموں ہی تک رہ جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے مقصد کی شکست فاش نظر آتی ہے۔''[۱۱] اردو ناول کے جدید عہد میں ''شکست'' اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے انفرادیت کا حامل ہے۔ ''شکست'' کرشن چندر کے تمام ناولوں میں فنی اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی زندگی کو موضوع بنایا گیا۔ کرشن چندر کی تخلیقات کا معتدبہ حصہ کا منظر کشمیر ہے۔ وہ کشمیر کے باسیوں کی غربت اور استحصال کو اکثر جگہوں پر موضوع بناتے ہیں۔ ناول کا موضوع ''روایتی جاگیردارانہ سماج کی کشمکش ہے۔''[۱۲] ناول میں دو کہانیاں متوازی چلتی ہیں۔ ایک شیام اور ونتی کا قصہ ہے اور دوسرا موہن سنگھ اور چندرا کی محبت کا قصہ ہے۔

پریم چند اپنے عہد کی مشکلات سے آگاہ ہیں اور عصری مسائل کا ادراک رکھتے ہیں۔ ''شکست'' میں عصری مسائل، بے چینی اور سماجی کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گویا یہ ناول محض نوجوان مرد اور عورت کی محبت کی داستان نہیں بلکہ اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے۔ شیام اس ناول کا ہیرو ہے۔ البتہ منٹو کے خاکے ''مرلی کی دھن'' کے موضوع اور اپنے زمانے کے معروف فلمی ہیرو شیام سے خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ شیام کے کردار کی انفعالیت کا تجزیہ کرتے ہوئے جگدیش چندر و دھاون لکھتے ہیں:

> شیام باغیانہ اور انقلاب پسندانہ خیالات کا حامل ہے اور وہ فرسودہ اور بوسیدہ معاشرے کو بدل کر رکھ دینا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت و حوصلہ نہیں۔ اس کی یہی بے عملی اور پست ہمتی اسے ایک انفعالی کردار بنا دیتی ہے۔[۱۳]

شیام اور علی جو دونوں کردار سماجی و سیاسی تبدیلیوں اور معاشرتی خرابیوں پر فلسفیانہ بحث کرتے رہتے ہیں۔ ''لندن کی ایک رات'' کے کرداروں کی طرح ''شکست'' کے کردار بھی محض فکری مباحث ہی کرتے پائے جاتے ہیں، عمل کی قوت سے محروم رہتے ہیں۔ شیام اشتراکی فلسفے کا علمبردار ہے اور علی جو کو اس کی متواتر تبلیغ کرتا ہے۔ ''شکست'' کا موضوع سماج اور محبت کرنے والوں کی آویزش ہے۔ کرداروں کی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار سماج اور اس کی روایت پسندانہ مذہبی تنگ

نظری ہے۔ طبقاتی کشمکش اور مذہبی اجارہ داری، رسوم و رواج میں جکڑے انسان مسلسل استحصال کا شکار ہو رہے ہیں اور وہ اسے بدلنے کی خواہش میں خود رزق خاک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً چندرا اپنے محبوب موہن سنگھ کو نہیں مل سکتی کہ مذہب کے اجارہ دار پنڈت سروپ کشن کو یہ گوارہ نہیں کہ راجپوت نسل خراب ہو، اسی طرح شیام برہمن ہے اور وہ نیچ ذات اور سماج کی دھتکاری ہوئی ونتی سے شادی نہیں کر سکتا، نہ ہی ونتی کی خودکشی پہ کوئی افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ خالد اشرف اس عصری صورتحال کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> کرشن چندر کا یہ ناول ایک حد تک رومانوی اور اصلاحی ہے جو ہندو سماج کی زمانہ قدیم سے مروجہ ذات پات کی درجہ بندی کے خلاف تحریر کیا گیا ہے۔۔۔ مصنف نے اس ناول میں فطرت کی گود میں جن کرداروں کی زندگی کو ترتیب دیا ہے ان کے گرد فطرت کا حسن اور پاکیزگی کا ہالہ ضرور موجود ہے۔ لیکن وہ سب کے سب نیم مردہ ہیں۔ شکست اور محرومی ان کا مقدر ہے ان کے معصوم خواب جاگیرداری تہذیب کے ظالم شکنجے کی جکڑ میں آ کر دم توڑ جاتے ہیں۔[۱۴]

اس ناول کی اہمیت نئی اور پرانی قدروں کی آویزش کی وجہ سے ہے۔ ناول نگار عصری حسیت سے آگاہ ہے اور اپنے عصر کے تقاضوں کو سمجھنے اور اس کے مطابق ڈھل جانے پر اذہان کو آمادہ کرتا ہے۔ شاید اسی لیے ناول کا نقطہ نظر اصلاحی محسوس ہوتا ہے۔ کرشن چندر اپنے کرداروں کے ذریعے معاشرتی مسائل بیان کرتے ہیں۔ مثلاً شیام ترقی پسند یا اشتراکی خیالات کی وجہ سے طبقاتی کشمکش، خودغرضی، سماجی جبر و استحصال، عدم مساوات وغیرہ سے نجات کا طالب ہے اور علی جو ایک عملی انسان نظر آتا ہے۔ اس کے نظریاتی آدرش بڑے نہیں ہیں وہ دنیا دار آدمی ہے جبکہ شیام عملیت پسندی سے عاری ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیام جو کہ ایک واضح نصب العین کا حامی ہے آخر سماجی تبدیلی کے لیے جدوجہد سے کیوں کتراتا ہے؟ اس کا ایک سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق متوسط طبقات سے ہے جو صرف نظریات کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ شیام عمل سے عاری ہے مگر مساوات کا متلاشی ہے۔ وہ مساوات کا اس لیے بھی قائل ہے کہ اس طرح اسے جدوجہد کیے بغیر سماج میں برتر حیثیت حاصل ہونے کا امکان ہے۔ علی جو کے لیے مساوات، اشتراکیت، طبقات محض اصطلاحیں ہیں۔ اس کا تصور سماج بالکل مختلف ہے۔ وہ عوام کو منتشر قوت خیال کرتا ہے اور بجا طور پر درست سمجھتا ہے کہ ایک خاص طبقہ ہمیشہ حکمران رہا ہے۔ شیام اور علی جو کے مابین سیاست اور اشتراکیت پر دلچسپ بحث ہوتی ہے۔ علی جو کی باتیں کڑوی ہیں مگر ان میں صداقت ہے۔ علی جو کا نقطہ نظر ہے کہ جسے تبدیلی کہتے ہیں، ہندوستان کے مخصوص مزاج میں اس کا گذر نہیں ہے۔ وہ سماج کی بے رحم طاقت کا ہمنوا ہے ''سماج بڑی بھاری طاقت ہے۔ سماج انسان کی اجتماعی عقل اجتماعی قوت کا دوسرا نام ہے۔ سماج سے انحراف کسی صورت اچھا نہیں ہو سکتا۔''[۱۵]

دراصل یہی کرشن چندر کا بھی عصری شعور ہے البتہ وہ اس رومانوی خواب کے اسیر بھی ہیں کہ دنیا بدلے گی۔ لیکن علی جو انسان اور سماج کے رشتے کی عملی حقیقت کو سمجھتا ہے گویا کرشن چندر اس صورتحال سے آگاہ ہیں کہ انسان صدیوں کی

غلامی کا خوگر ہو چکا ہے۔ اچھا ادب اپنے زمانے کا عکاس ہوتا ہے۔ کرشن چندر کے ناولوں میں بھی بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے البتہ وہ ایک خاص مثالیت پسندی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ اپنے عہد کے محدودات علم کا بیان اور نظریہ کی ترویج ''شکست'' میں بخوبی ہو ئی ہے۔ مناظر فطرت کا بیان تو ان کی رومان پسندی کا اظہار ہے اور انسانی مسائل، انسان کی غربت، بھوک، سرمایہ داری کا فریب، استحصال، سرمایہ ومحنت کی کشمکش، سامراجی ذہنیت اور خود سامراجی حکمرانوں کی ریشہ دوانیاں، طبقاتی جدوجہد وغیرہ ان کے ناول کا موضوع ہیں۔ کرشن چندر کی عصری آ گہی کی وضاحت ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے ان الفاظ میں کی ہے:

> بعض ایسے امور جو رومانی اور اشتراکی نظریات سے متصادم نہیں تھے ان کی توجہ کا مرکز بنے۔ فرد اور سماج کے تغیر پذیر رشتوں، فرد کے داخلی تضادات اور تیز رفتار معاشرے میں تمام تر مادی آسودگیوں کے باوجود انسانی روح کی تشنگی پر انھوں نے نگاہ ڈالی۔ انسان خود اپنے ہی تضادات کا کس طرح شکار ہو جاتا ہے، اس کا بھی مشاہدہ کیا۔ بدلتے ہوئے مسائل و حالات کے ساتھ جذباتی اور ذہنی رویوں کی تبدیلی کو بھی دیکھا اور اسے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ [۱۶]

کرشن چندر نے اس ناول میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی سیاسی، سماجی اوراخلاقی تبدیلیوں کے لیے ایک نئے ذہن کی تیاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ناول کے بعض کردار سماجی حقیقت نگاری کے آئینہ دار ہیں۔ کرشن چندر انسان دوست فن کار ہیں اس لیے ان کے ہاں مثالیت کے عناصر کی بہتات ہے البتہ وہ اپنے عصر کے بھی نبض شناس ہیں۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی اقدار کے بدلنے سے ذہنوں میں آنے والی تبدیلیوں سے وہ آ گاہ ہیں اور اس امر سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ سماج کو روایتی اقدار کر ترک کرنا ہوگا۔ یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> یہ ناول اس طرح جدید دور کے انتشار اور بے چینی اور کرب کو بھی پوری طرح سے پیش کرتا ہے۔ قدروں کی تبدیلی سے نوجوانوں کے ذہنوں میں اور خیالات میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں یا پیدا ہو چکی تھیں ان کو بھی اس ناول میں ہر جگہ نمایاں کیا گیا ہے۔ [۱۷]

کرشن چندر کا عہد اشتراکی حقیقت نگاری کا عہد تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ کرشن چندر بھی اپنے عصر کے مزاج علم (Episteme) سے آ گاہ تھے اور اس کا اظہار ''شکست'' میں خوب ہوا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے وقت جس اخلاقیات کا مظاہرہ ادب میں کیا جارہا تھا ظاہر ہے وہ نوآبادیات کا پیدا کردہ تھا۔ نو آبادیات مفتوحہ سماج کے افراد میں ان کے تاریخی رشتے منقطع کر کے انھیں اپنے دیے ہوئے تاریخی و تہذیبی شعور سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ سو افراد معاشرہ اپنی نوآبادیاتی حیثیت تبدیل نہ کر سکنے کی وجہ سے سامراج کی خواہشات کی تکمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ ''انگارے'' کی اشاعت نے جس اخلاق باختگی کے سوال کو شدومد سے اٹھایا تھا اسے نوآبادیات نے اپنے حق میں استعمال کیا اور کتاب پر پابندی لگا دی۔ اس پابندی کو اس سوال کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا چاہیے کہ کیا سامراج اپنے نوآبادیاتی

مقاصد اور مفادات کی راہ میں انسان کی فطری اور جبلی خواہشات کے اظہار کو رکاوٹ تو نہیں سمجھ رہا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ انھیں احساس ہو گیا ہو کہ اگر نفسی و نفسیاتی کیفیات کے اظہار کا بند در کھل گیا تو اس کے راستے سے آزادی اظہار اور اس کے طفیل کامل آزادی کی لہریں موجزن ہو جائیں گی؟ یا پھر نوآبادیات کو پسند نہیں تھا کہ محکوم اقوام جدید یورپی علوم تک رسائی حاصل کر سکیں۔

سوال کچھ بھی ہو مگر اردو ادب میں انسان کی نفسی و نفسیاتی خواہشات کا حقیقت پسندانہ اظہار ہونے لگا تھا۔ ''امراؤ جان ادا'' کے بعد پہلی بار عصمت کے ناولوں میں عام طبقات کی خواتین موضوع بننے لگیں۔ عصمت چغتائی نے لکھنو کے مسلم متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کشمکش کو موضوع بنایا اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کا بے باکانہ اظہار کیا۔ عصمت کے ناولوں میں عورتوں کی نفسیاتی کیفیات، جنسی ہیجان، جذباتی کشمکش اور ایسے مسائل کی پیش کش ہے جن کا ابھی ہندوستان کی عورتوں کو ادراک بھی نہیں تھا۔ ایسے ماحول میں جہاں عورت اپنی جبلی خواہشات کو کچلنے میں شرافت سمجھتی ہو اور گھٹن کے شکار ہونے کو تقدیر خیال کرتی ہو بلکہ اسے اس گھٹن کا احساس تک بھی نہ ہو، اس ماحول میں عصمت نے اپنے شعور اور آگہی کی بدولت عورت کے نفسیاتی و جنسی مسائل کو موضوع بنایا۔ ان پر عریاں نگاری کے الزامات بھی عائد ہوئے۔ ابتداً ترقی پسندوں نے ان الزامات کو رد بھی کیا البتہ بعد ازاں ترقی پسند ناقدین نے ہی عصمت اور منٹو کو آڑے ہاتھوں لیا۔ البتہ مجنوں گورکھپوری ترقی پسندی کے ناطے عصمت کی عریاں نگاری کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''عصمت نے جس بے باکی اور جرأت کے ساتھ ان پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہمارے ادب میں اس کی کمی تھی اور اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی۔''[۱۸]

اکثر ترقی پسندوں نے فرائڈ کے نفسیاتی تصورات سے خود کو ہم آہنگ نہیں سمجھا لیکن بیشتر کے ذہنوں پر فرائڈ سوار ضرور رہا ہے۔ ان کا زندگی کی نفسی و نفسیاتی جہات دیکھنے کا رویہ فرائیڈین ہے اسی ناطے وہ عریاں نگاری کو آزادی اظہار کا لازمہ سمجھتے ہیں اور اس پر معترض ہونے والوں کو رجعت پسند قرار دیتے ہیں۔ عصمت کی تخلیقی منہاج کو گو کہ ترقی پسندوں نے عریاں نگاری سے خارج قرار دیا ہے لیکن ایسا درست نہیں۔ جنس نگاری عصمت کی تحریروں میں بعض اوقات مقصود بالذات بن جاتی ہے۔ وہ ناول میں ایسے جملے بار بار استعمال کرتی ہیں جن سے بچا جا سکتا تھا یا اشارہ کر کے گذرا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات وہ محض کوئی جملہ لکھنے کے لیے وقوعے کا رخ موڑ لیتی ہیں۔ البتہ یوسف سرمست کا خیال ہے کہ جنس نگاری عصمت کا مدعا نہیں ہے بلکہ وہ ایسے انداز سے تذکرہ کرتی ہیں کہ اس سے ایک ''تنفر کا احساس'' ابھرتا ہے۔ دراصل عصمت اپنے ناولوں کو مقبول بنانے کے تمام گر جانتی تھیں اس لیے وہ ایسے تمام مصالحے استعمال میں لاتی ہیں جو ناول کی مقبولیت کا باعث ہو سکیں۔ ایسی عریاں نگاری کی مثالیں ''ٹیڑھی لکیر'' اور ''معصومہ'' میں بکثرت موجود ہیں۔ ''ٹیڑھی لکیر'' تقسیم ہند سے قبل شائع ہونے والا عصمت کا نمائندہ ناول ہے۔ اس کی کہانی ایک کردار ''شمن'' کے گرد گھومتی ہے اور اس کی زندگی کے مختلف مدارج کا احاطہ کرتی ہے۔ ناول کا موضوع شمن کی زندگی کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنا ہے اور اس کی زندگی کے اتار

چڑھاؤ کو پیش کرنا ہے۔مختلف واقعات اور حالات کو پیش کرنے میں عصمت نے ڈرامائی طریقہ کار اختیار کیا ہے۔

اس ناول کی اہمیت فقط یہ ہے کہ اس کا ایک کردار جو محبت کی محرومی کا شکار ہے وہ آئندہ زندگی سے کیسے مقابل ہوتا ہے۔ البتہ ناول میں عہد سامراج کے متوسط مسلم گھرانوں کے تہذیبی بحران کا نقشہ بھی نظر آتا ہے۔ سماج کی عمومی خود غرضی، مفاد پرستی، معاشی تنگ دستی اور معاشرتی ناہمواری بھی ناول کا موضوع بنتے دکھائی دیتے ہیں۔عصمت کا خیال ہے کہ یہ ناول نفسیاتی جنسی مسائل کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ انھوں نے ماحول کے شخصیت پر اثرات کو ظاہر کیا ہے۔ عصمت نے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' میں ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جس کی زندگی ٹیڑھی لکیر ہے اور اس کے اس ٹیڑھ پن، اس کی فکری اور عملی کجروی میں اس کے ماحول کو ضرور دوش دیا جا سکتا ہے اور یہ ماحول اس عہد کے تمام مسلمان متوسط شہری طبقات کا ماحول تھا۔ عورت اور متوسط طبقے سے تعلق ہونے کے ناطے خود عصمت کو عورتوں کے احوال کا اچھا تجربہ تھا۔''ٹیڑھی لکیر'' کی فضا محدود ہے۔ ناول کا مرکز متوسط طبقات کی زندگی اور اس کے تجربات و مشاہدات ہیں۔ ناول میں کرداروں کی داخلی زندگی ابھارنے پر عصمت نے توجہ مرکوز رکھی ہے۔

ہندوستانی سیاست، طبقاتی استحصال اور اقتصادی صورتحال کا جائزہ ناول کے اس حصے میں موجود ہے جہاں شمن اور افتخار کا معاشقہ بیان ہوتا ہے۔ یہ شمن کی زندگی کی تیسری منزل ہے۔ یہاں عصمت کے ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شمن جیسی لڑکی ایسے آدرش کا اظہار کر سکتی ہے، ناول کا یہ حصہ نظریاتی ہے۔ جرمنی کے حملہ آور ہونے کے واقعے پر افتخار اور شمن میں مکالمہ ہوتا ہے تو ہندوستان کی غلامی بھی موضوع بنتی ہے۔عصمت کا سیاسی شعور یہ جانتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی خون کو بے مول بہا دیا گیا ہے اور جس آزادی کے عوض یہ خون مانگا گیا تھا وہ سویرا ابھی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔اسی طرح ناول میں ہندستانیوں کی انگریزوں سے نفرت کا اظہار بھی ملتا ہے لیکن یہ سب معاملات قصہ میں گوکہ آمیخت ہو کر نہیں آئے لیکن شمن کی خارجی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے عصمت نے عالمی سیاست کے حالات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ افراد قصہ ان حالات سے کیسے متاثر ہوتے ہیں ان کے داخلی احساسات کے پیکر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ شمن ہندوستان کی آزادی کے لیے ترقی پسند گروہ میں شمولیت اختیار کرتی ہے اور بطور سرگرم کارکن کے خدمات بھی انجام دیتی ہے۔ ناول میں ترقی پسندوں پر طنز کی سی کیفیت بھی موجود ہے۔ طنز کی یہ لہر سماج کی دیگر خامیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ ناول میں مندرج کچھ واقعات قصہ کا لازمی جزو بن کر سامنے نہیں آتے مثلاً دوسری جنگ عظیم والا حصہ لگتا ہے کہ مصنفہ نے ضخامت اور ناول کا کینوس بڑھانے کے لیے شامل کیا ہے۔عصمت نے جنگ کے واقعات کا ذکر ضرور کیا ہے اور ہندوستان پر جنگ کے اثرات بھی دکھائے ہیں مگر یہاں وہ کامیاب نہیں ہو سکیں اور نہ ہی اس سے کوئی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ جنگ کا تذکرہ ناول کے قصہ میں آمیخت ہو کر نہیں آیا بلکہ غیر ضروری محسوس ہوتا ہے۔ اس ناول کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے کرداروں کو ابھارتے ہوئے عصمت نے زندگی کے بہت سے حقیقی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔عصمت کا پختہ خیال ہے کہ انسان حالات کے سامنے بے بس ہے اور وہ ماحول کے مطابق خود بخود ڈھلتا رہتا

ہے۔ سید وقار عظیم عصمت کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عصمت نے اپنے ذاتی مشاہدات کو گہرے فکر اور وسیع تخیل میں سمو کر مکمل طور پر قاری کے مشاہدات بنا دینے کا کام جس طرح ''ٹیڑھی لکیر'' میں انجام دیا ہے اب تک کوئی عورت ناول نگار انجام نہیں دے سکی تھی۔[۱۹]

ناول میں مسلم متوسط طبقات کی تہذیبی کشمکش کا پہلو دلچسپ ہے۔ ''ٹیڑھی لکیر'' عصمت کا نمائندہ ناول ہے۔ ان کے باقی ناول اس ناول کے فنی شعور سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ عصمت کا فنکارانہ شعور اپنے عصر کی آگہی تو رکھتا ہے اور وہ بیدار مغز تخلیق کار بھی ہیں مگر سماجی و تہذیبی شعور کو ناول کی فضا میں گوندھ کر نہیں لا سکیں۔ نظریاتی اساس کہانی کی تہہ میں گھل مل کر نہیں آئی تاہم اپنے عصر کے اعتبار سے یہ کامیاب تخلیقی کاوش تھی۔ عصمت کا تہذیبی شعور متوسط مسلمان گھرانوں کی اندرونی عکاسی بخوبی کرتا ہے۔ وہ روزمرہ کی بول چال کا استعمال خوب جانتی ہیں۔ عصمت واقعات قصہ سے زیادہ کردار قصہ کو ترجیح دیتی ہیں اور کہانی کو کرداروں کے عمل پر آگے بڑھاتی ہیں اور یہی ان کی کامیابی ہے۔

پریم چند اردو ناول کو سماجی حقیقت نگاری کی جس سطح پر لے آئے تھے ترقی پسند تحریک کے لیے لازمی تھا کہ وہ نئے سنگ میل مقرر کرے اور ناول کو نئی جہات تک لے کے جائے۔ ایسا دو حوالوں سے ممکن تھا، یعنی بدلتی ہوئی زندگی اور جدید علوم کی آمد سے اثر پذیر ہوتی زندگی نیز سماجی و ثقافتی تغیر کو موضوع بنایا جائے اور ساتھ ہی مغرب میں ہونے والے تخلیقی تجربات سے بھی استفادہ کیا جائے۔ ترقی پسند مصنفین نے دونوں سے استفادہ کیا۔ اس ضمن میں ''لندن کی ایک رات'' خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جس میں جدید نفسیاتی تصورات کو بھی ترقی پسند افکار کے ساتھ برتا گیا اور ہندوستانی تہذیب کے علی الرغم صنعتی یورپ کی تہذیبی و سماجی زندگی، تشکیک پسندی، آزاد جنسی تعلقات، نیا معاشرتی ماحول، آزاد اور غلام اقوام کی کشمکش کو موضوع بنایا گیا۔ سجاد ظہیر کے بعد یورپی معاشرت، جنسی آزاد خیالی، نفسیاتی کشمکش، تہذیبی ماحول کی گھٹن وغیرہ کو عزیز احمد نے موضوع بنایا۔ عزیز احمد نے برصغیر کے بورژوا سماج، جاگیردارانہ طرز عمل، طبقاتی تفاوت کے علاوہ فرد کی جنسی زندگی یا جنس زدگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ عزیز احمد اردو کے ابتدائی ناول نگاروں میں اہمیت کے حامل تخلیق کار ہیں۔ ان کے موضوعات بھی دیگر لکھنے والوں سے الگ اور منفرد ہیں۔ ''ہوس''، ''مرمر اور خون''، ''گریز''، ''آگ''، ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور ''شبنم'' جیسے ناول لکھنے کے بعد انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا دھارا بدل لیا البتہ یہ ناول اردو ناول نگاری کی روایت میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ عزیز احمد کی ناول نگاری کی مجموعی فضا رومانوی طرز احساس کی حامل ہے اور یہ رومان جنسی ہیجان کی حدوں تک پہنچتا دکھائی دیتا ہے۔ رومان اور جنس کا امتزاج بالآخر کسی سماجی مسئلے کی نشاندہی پہ ختم ہوتا ہے۔ البتہ عزیز احمد کے ناولوں کے حوالے سے یہ تاثر قائم رہتا ہے کہ وہ عریاں نگاری سے دامن نہیں بچا پائے۔ اس دور کے ناول نگاروں کا یہ عام چلن تھا کہ وہ حقیقت نگاری کے زیر اثر عریاں نگاری کو جائز سمجھتے تھے۔ البتہ عریاں اور فحش میں حد فاصل برقرار رکھنا مشکل امر ہے۔ ''گریز'' ایسا ناول ہے جسے ''ہوس'' اور ''مرمر اور خون'' کی طرح عزیز احمد نے اپنانے

سے انکار نہیں کیا۔ البتہ ان کے خیالات کی یہ تبدیلی بہرحال اس زمانے کی ہے جب وہ ناول نگاری سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ عزیز احمد حقیقت نگاری سے بھی بڑھ کر فطرت نگاری کو ترجیح دیتے ہیں۔ زندگی کی پیش کش وہ فطرت کے اصولوں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں۔شاید اسی لیے عزیز احمد جنسی کیفیات کے اظہار میں نہایت بے باک ہیں۔عزیز احمد کا عہد مذہبی تشکیک پسندی، عقلیت پرستی، سائنسی تعقلات پر یقین کا دور تھا۔ عریاں نگاری دراصل ہر طرح کی مذہبی اور سماجی اخلاقی قدروں سے بیزاری کے نتیجے میں بطور بغاوت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ بغاوت کوئی تعمیری رخ متعین نہیں کر سکی۔ عزیز احمد بھی انسان کی داخلی کشمکش اور اندرونی خلفشار کو موضوع بناتے ہیں اس لیے وہ کرداروں کی جذبات نگاری بخوبی کرتے ہیں البتہ اس عہد کی تشکیک پسندی ان کے تمام ناولوں کا حصہ ہے۔ وہ فطرت کی پیروی کو انسان کا بنیادی وظیفہ قرار دیتے ہیں اور اس پر سماجی قیود کو فرسودہ خیال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف سرمست ''ہوس'' کے حوالے سے عزیز احمد کی جذبات نگاری کو سراہتے ہیں ان کا مزید خیال ہے کہ عزیز احمد کے ناول میں جنس محبت کا ذیلی جذبہ بن کر آئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس ناول میں انھوں نے مختلف جذبات کے نازک فرق کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ''محبت'' اور ''ہوس'' کے فرق کو بڑی عمدگی سے نمایاں کیا ہے گو ''ہوس'' عزیز احمد کا سب سے پہلا ناول ہے لیکن اس میں بھی جذبات کے اتار چڑھاؤ کی وہ بہترین عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ عزیز احمد انسانی فطرت کے بہترین نباض ہیں۔[۲۰]

عزیز احمد البتہ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کا اظہار خوب کرتے ہیں۔ ناول کی سنجیدگی کا معیار یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے سماج کی درست عکاسی کرے اور ناول کا قصہ کوئی ایک مجموعی تاثر اور ایک گہری فکر قاری پر ثبت کرے۔ البتہ عزیز احمد کے یہ دونوں ابتدائی ناول گہرے سماجی شعور سے عاری ہیں اور نوجوانی کے مچلتے جذبات سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ نوجوانی کی جنسی خواہشات کا اظہار ان کا اصل موضوع رہتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنے عہد کے قبول عام ادب (Popular literature) کا حصہ ٹھہرتے ہیں۔ اسی لیے ان دونوں ناولوں کو بعد ازاں عزیز احمد نے مسترد کر دیا تھا۔

جذباتی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کے بیان کا یہ رجحان ان کے دیگر ناولوں میں بھی موجود ہے البتہ ''گریز''، ''آگ'' اور ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں عزیز احمد کا سیاسی و سماجی شعور زیادہ پختہ صورت میں سامنے آیا ہے۔ ان میں ہندوستان کی منتشر تہذیب، تہذیبی اختلاط، سیاسی استحصال کا احساس، معاشی تفاوت، طبقاتی تفاوت وغیرہ کی آگہی زیادہ ملتی ہے۔ ان کی فطرت نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ اصل حقائق کی پیش کش کا عالمانہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ البتہ جنس نگاری ایسا وصف ہے جو ان کے تمام ناولوں میں موجود ہے۔ اگر جنسی اظہار کا موقع نہ بھی ہو تو وہ عصمت کی طرح ایسا موقع خود نکال لیتے ہیں۔عزیز احمد کے کردار جنسی ناآسودگی کا شکار ہیں۔ یہ ناآسودگی اس ماحول کی بھی ہے جو انھیں درپیش ہے۔جس ہیرو پر عزیز احمد نے زیادہ توجہ صرف کی ہے وہ ناول ''گریز'' کا ہیرو ''نعیم'' ہے اور وہ بھی عورت سے پہلا تعلق جنس کا ہی

قائم کرتا ہے۔''گریز'' کے حوالے سے یہ بات درست ہے کہ اس کا ہیرو روایتی محبت کا اسیر نہیں بلکہ وہ جنسی جذبہ کو محبت کے جذبہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔''گریز'' کے موضوعات کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ایک ہندوستانی آئی، اے، ایس کی ذہنیت انگلستان جا کر کیا ہو جاتی ہے، زندگی کو وہ کس رنگ سے دیکھتا ہے اور اس کی زندگی میں عیش کوشی اور لذت پرستی، یورپ کے ماحول سے جس طرح داخل ہوتی ہے اس کی بہترین تصویر 'گریز'' میں پیش کی گئی ہے ۔''گریز'' زندگی سے گریز ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے گریز ہے۔ حد یہ کہ محبت اور عشق کی تلخیوں سے بھی ناول کا ہیرو نعیم گریز کرتا ہے۔نعیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار بیسویں صدی کے تمام اہم رجحانات کا آئینہ دار ہے ۔ نہ تو اس کے پاس اخلاقی قدروں کا واضح تصور ہے نہ ہی مذہبی بندشوں کا لحاظ وہ ایک تشکیک کی حالت میں ہے ۔ وہ سائنس اور نئے علوم اور نئے نظریات سے پوری طرح واقف ہے لیکن اس آگہی کی وجہ سے وہ زندگی سے غیر مطمئن ہے۔[۲۱]

ناول میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ ہے۔ گویا یہ دو عظیم جنگوں کے درمیان کا دور ہے اس لیے قلوب منتشر ہیں۔ اذہان خوف زدہ ،دماغ نئے سائنسی تعقلات کی بھول بھلیوں میں گم ہیں اور تاریخی، تہذیبی اور سماجی عوامل تیزی سے بدل رہے ہیں۔ خود ہندوستان میں جدید علوم نے ہر طرح کے اذہان کو متاثر کیا ہے۔ جدید فکریات اور سماجی سائنسی نظریات کی آگہی نے ہندوستان کے محکوم سماج میں اپنے حقوق، انسانی مساوات وغیرہ کے تصورات کو جنم دیا ہے اور اس شعور نے آزادی کی تحریک کو مہمیز لگا دی ہے۔ جدید سائنسی ترقی کی بدولت ذرائع ابلاغ کی دستیابی نے نئے نظریات کو پھیلانے اور ذہنوں کو متاثر کرنے کے عمل کو تیز کر دیا ہے۔ شاید اسی لیے اس عہد کے قریباً تمام ناولوں کے ہیرو نہایت ذہین کردار ہیں۔''نعیم'' ''لندن کی ایک رات'' کا ہو یا ''گریز'' کا اسے ہندوستان کی محکومی کھلتی ہے۔ اسی طرح ''اداس نسلیں'' کا نعیم، گو کہ وہ مجہول کردار ہے، لیکن ہندوستان کی محکومی اس کا بھی مسئلہ ہے۔عزیز احمد نے جنگوں کے اس درمیانی وقفے کے عہد کے یورپ کی معاشرت اور عالمی سیاست کو نہایت عمدگی اور مکمل عصری شعور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ گویا ''گریز'' اپنے سیاسی، سماجی اور تہذیبی ماحول کو موضوع بنائے یا اس کے انتشار سے جنم لیتی نفسیاتی کشمکش، جنسی گھٹن اور بے راہ روی کو موضوع بنائے، اپنے عصر کی عصریت کا جامع احاطہ کرتا ہے۔ نعیم اور اس جیسے دیگر کردار اپنے عصری حالات سے آگاہ ہیں۔ بیسویں صدی کے علوم سے روشناس ہیں جو انھیں زندگی کے متعلق آگہی بخش رہے ہیں اور یہ آگہی انھیں ناآسودہ کیے رکھتی ہے۔''گریز'' کی اہمیت بھی اسی امر میں ہے کہ اس میں اس عہد کی غیر یقینی اور بے اطمینانی کو پوری شدت سے پیش کیا گیا ہے۔ بالخصوص ہندوستان کے بارے میں مغرب کو کس طرح بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ اس کا احساس مغرب میں ۱۹۴۰ کے آس پاس کے حالات دیکھ کر ہوتا ہے۔نعیم کے اندر یہ بے اطمینانی دو طرفہ ہو جاتی ہے کہ ایک طرف مغرب اس کے ملک کی صورتحال سے بے خبر ہے اور دوسری طرف ظلم کی سیاہ رات ہے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔البتہ نعیم کا مجموعی رویہ گریز کا ہے۔ مثلاً وہ ''لندن کی ایک رات'' کے اپنے ہم نام ہیرو کی طرح عمل کی قوت سے

محروم ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق سے وہ آگاہ ہے مگر انھیں بدلنے کی عملی کوشش اس میں مفقود ہے۔ وہ تو محبت بھی نہیں کر سکتا محض جنسی تلذذ کا حصول اس کا مقصد ہے جو بجائے خود عملیت سے فرار ہے۔ یہ ایسا کردار ہے جو سماجی اور تہذیبی اعتبار سے ایک دوراہے پر کھڑا ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی اسے نئی صورت حال درپیش ہے۔ مغرب کی چمک دمک اسے متاثر ضرور کرتی ہے مگر اس کا کھوکھلا پن بھی ظاہر ہے اور مشرق اپنی روایت پرستی اور قدامت پسندی کے باعث جدید علوم و فنون کا ساتھ نہیں دے پا رہا۔ نعیم اس عہد کے انتشار اور بے اطمینانی کا نمائندہ کردار ہے۔

عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں سماج میں پھیلی برائیوں کو بھی براہ راست موضوع بنایا ہے۔ سائنسی ایجادات، صنعتی ترقی اور جدید علوم کی وجہ سے عام ذہنوں میں تبدیلی رونما ہو رہی تھی اور ساتھ ہی اخلاقی و مذہبی قدریں بھی روبہ زوال تھیں۔ بے اطمینانی سماج کا عام چلن تھا گویا افراد معاشرہ ذہنی تذبذب اور بے چینی کا شکار تھے۔ ''گریز'' ان سب امور کی ترجمانی کرتا ہے۔ ناول کے ہیرو نعیم کی ذہنی کیفیات اس کی زندگی کی داخلی و خارجی ناآسودگی کا نتیجہ ہیں اور جذباتی کیفیت اپنے عصر کی شکست و ریخت کی نمائندہ ہے۔ مغربی سیاسی صورتحال، جنگ کی سراسیمگی، اخلاقی زبوں حالی، معاشی مسائل اور معاشرتی زندگی کی جھلک بھی ''گریز'' میں جابجا موجود ہے۔ گویا یہ ناول اپنے عہد کے ذہنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی بحران کے پس منظر میں آگے بڑھتا ہے۔ عزیز احمد کا سیاسی شعور اپنے عہد کے سیاسی انتشار سے آگاہ ہے اور اس انتشار کی وجوہات بھی جانتا ہے:

> سیاسی صورت حال پیچیدہ ہے۔ بہت زیادہ۔ تمہارے سر میں یہ خیال کہاں سے سما گیا کہ میونک (میونخ) کی شرمناک صورت حال کے بعد ہم بچ جائیں گے۔۔۔ دنیا بھر کی حالت ذلیل ہے۔ فرانس میں دلاوئے ایک غیر سرکاری آمرانہ حکومت چلا رہا ہے۔ یہاں کا جو حال ہے سو ہے ہی۔ ترکی، اس جمہوری گلّے میں نئے رنگروٹ بھیڑ کی طرح بھرتی ہوا ہے۔ پولینڈ میں بدترین قسم کی فوجی آمریت ابھی تک باقی ہے۔ لیکن بہر حال انہی ممالک کو اس زمانے کی سب سے بڑی بدنہاد طاقت سے مقابلہ کرنا ہے۔ دان تسگ کے معاملے میں ہٹلر اگر کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کے وقار کو اس ملک میں صدمہ پہنچے گا۔ جہاں وہ اگر برسر اقتدار رہنا چاہے تو اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ یعنی جرمنی میں۔ اگر وہ قدم اٹھائے اور جمہورتیں مقابلہ نہ کریں تو ہٹلر مرغ کی طرح بانگ دے گا اور جمہوریتوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ اگر ہٹلر قدم اٹھائے اور جمہورتیں مقابلہ کریں۔ تب تو ظاہر ہے کیا نتیجہ ہوگا۔ جنگ۔۔۔[۲۲]

عزیز احمد کے ناول ''آگ'' میں عصری صورتحال زیادہ شدت سے ظاہر ہوئی ہے۔ ''گریز'' میں ہندوستانی عصریت بالعموم مغربی تناظر میں دکھائی دیتی ہے لیکن ''آگ'' میں براہ راست ہندوستان موضوع ہے۔ کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کے بعد ''آگ'' دوسرا ناول ہے جس کا پس منظر وادی کشمیر ہے۔ غربت اور سماجی استحصال دونوں ناولوں کا مشترکہ موضوع ہے۔ ''آگ'' کے موضوع کے حوالے سے سلیمان اطہر کا کہنا ہے:

''گریز'' کے پس منظر میں اپنے عہد کی سیاست جس قدر بھی ہو ''آگ'' میں اس کا تناسب افزوں ہو گیا ہے۔ یہ سیاست مقامی بھی ہے اور عالمی بھی۔ بنیادی طور پر کشمیر، کشمیر کی تہذیبی زندگی بلکہ کشمیری مسلمانوں کی تہذیبی زندگی ''آگ'' کا موضوع ہے۔[۲۳]

اس ناول کا زمانہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کا ہے۔ ناول دو حصوں پر ''شنید ہ'' اور ''دیدہ'' پر مشتمل ہے۔ دراصل ناول کشمیر کی سیاسی، تمدنی، جغرافیائی اور تاریخی زندگی کے تناظر میں ہندوستانی زندگی کی مرقع کشی کرتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی، تہذیبی، سماجی اور معاشی صورتحال میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اس کے براہ راست اثرات کشمیر کی زندگی اور سماج پر بھی مرتب ہو رہے ہیں۔ ''آگ'' میں کشمیر کو موضوع بنانے کا خیال، ممکن ہے کہ عزیز احمد کو ''گریز'' لکھتے ہوئے ہی آ گیا ہو کیونکہ ''گر یز'' کے آخر میں نعیم کشمیر پہنچ جاتا ہے۔ یہاں یعنی ''گریز'' میں بھی ناول نگار نے کشمیر کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر جسے جنت نظیر کہا جاتا ہے لیکن و ہ آگ میں گھرا ہوا ہے۔ کشمیر اور اس کے عوام کے مقدر میں بھوک، افلاس، استحصال، استبداد، حق تلفی اور عصمت فروشی ہی ہے:

اپنے ملک کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ہم لوگوں سے بھیڑ بکریاں گھوڑے خچر اچھے ہیں۔ وہ مار کھاتے ہیں تو کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے ہیں۔ ہمیں تو کسی چیز کا احساس ہی نہیں۔ یہ بھوک دیکھیے، یہ غربت دیکھیے، یہ افلاس، یہ سب دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے۔[۲۴]

''آگ'' ایک کشمیری خاندان کی تین نسلوں کی کہانی ہے۔ ناول نگار نسل درنسل ہونے والے استحصال اور استحصالی طبقات کی داستان لکھنا چاہتا ہے۔ ناول میں کشمیری زندگی کے تمام نشیب وفراز موضوع بنتے ہیں جو بالعموم تمام برصغیر کے لوگوں کی سماجی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کہانی اس عہد کی ہندوستانی سیاست کو بھی موضوع بناتی ہے اور ہندوستان کی معاشرت اور معیشت بھی زیر بحث آتے ہیں۔ دراصل مصنف کو احساس ہے کہ یہاں کا سماج ایک مسلسل آگ میں جل رہا ہے اور کشمیر جو برصغیر کی خوبصورتی کا استعارہ بھی ہے، اس کے آگ میں جلنے سے ناول نگار کی مراد برصغیر کی خوبصورتی کا سامراج اور اس کے گماشتوں کے ہاتھوں نابود ہونا ہے۔ یہ آگ دراصل نئے سماجی حالات، سیاسی استحصال، اقتصادی کسمپر سی، آزادی کے شعور اور نظام بدل دینے کی آگ ہے۔ عزیز احمد کا سیاسی شعور ہندوستانی تاریخ میں اس امر سے آگاہ ہے کہ یہاں غلامی اب مزاجوں کا حصہ بن گئی ہے اور یہ تہہ در تہہ غلامی کشمیر کی زندگی ہی نہیں بلکہ اس عہد کے عام ہندوستانی کی زندگی کو بھی متاثر کر رہی ہے:

ناول نگار کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تبدیلی کے پس منظر میں کشمیری زندگی کی تبدیلی کو پیش کرنے کی انتہائی کامیاب کوشش کی ہے۔ نئے حالات کی رو نئے خیالات کی آمد، نئے رجحانات، نئی بیداری، نئی سماجی اور سیاسی تبدیلی کشمیری زندگی میں سرایت کرتی دکھائی گئی ہیں۔[۲۵]

''ایسی بلندی ایسی پستی'' عزیز احمد کا مقبول ناول ہے۔ ناول کا بنیادی فریضہ ہے کہ وہ جس عصر کو اپنا موضوع بنا رہا

ہوتا ہے اس کے سماجی مسائل اور حالات کا جامع اظہار بھی اس میں ہونا چاہیے۔ یہ ناول بھی ''آگ'' کی طرح ایک سماج کی عکاسی کرتا ہے اور یہ سماج حیدرآباد دکن کا ہے۔ حیدرآباد کی اشرافیہ اور جاگیردارانہ طبقہ اس کا موضوع ہے۔ حیدرآباد کی تہذیب اور اس میں آنے والی تبدیلیاں عزیزاحمد کے اپنے مشاہدے میں تھیں اس لیے اس جاگیردارانہ تہذیب کو انھوں نے پوری واقعیت کے ساتھ سمیٹ لیا ہے۔ ''آگ'' کے علاوہ عزیزاحمد کے ہر ناول میں حیدرآباد کی تہذیبی جھلک ملتی ہے البتہ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں یہ تہذیبی عناصر زیادہ ہیں بلکہ اس ناول کا پس منظر ہی حیدرآباد ہے۔ اس ناول میں نچلے اور متوسط طبقات کی زندگی اور ان کی معاشرت بھی مل جاتی ہے لیکن اونچے اور اعلیٰ طبقے کی معاشرتی زندگی نمایاں ہے۔ اہم کرداروں کا تعلق اشرافیہ سے ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' عزیزاحمد کے گہرے مشاہدے کا آئینہ دار ہے۔ یہ ناول حیدرآباد کے بالخصوص طبقہ امرا کی معاشرت کو موضوع بناتا ہے۔ گو کہ حیدرآباد پر براہ راست انگریز حکمران نہیں تھے لیکن انگریزی تہذیب کے اثرات وہاں کے طبقہ امرا پر مرتسم ہوئے۔ ناول کا موضوع ہند اسلامی اور مغربی تہذیب کی آمیزش سے اثر پذیر طبقہ امرا ہے۔ یہ طبقہ دراصل مغرب کی کورانہ تقلید کر رہا ہے جس میں رقص و سرود، مے نوشی کی محفلیں، ہوس رانی و دیگر خرابیاں جاگیردارانہ سماج کی خرابیوں سمیت موجود ہیں۔ دکن کی تہذیبی معاشرت بھی زوال کا شکار ہے اور ناول میں اس کے زوال کی عکاسی کی گئی ہے۔ زوال آمادہ سماج کی عکاسی کرتے ہوئے عزیزاحمد ایک مبصر کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی وہ سماج کو بے تعلقی سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے یوسف سرمست نے عزیزاحمد کے فن کو ''غیر شخصی'' (Impersonal) کہا ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں کرداروں کے بجائے زیادہ تر توجہ زندگی کی پیش کش پر ہے اور اس پس منظر میں کرداروں کو اہمیت دی گئی ہے۔ عزیزاحمد کے مختلف ناولوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں:

> ''گریز'' صرف کرداری ناول ہے جس میں نعیم کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''شبنم'' میں بھی زور زندگی پر نہیں بلکہ کردار پر ہے۔ نعیم کی طرح شبنم بھی معاشرے کی لازمی پیداوار نہیں بلکہ انفرادی کردار ہے۔۔۔ ''آگ'' اور ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں زور زندگی پر ہے۔ ان کے کردار محض انفرادی ہستیاں نہیں وہ اپنے معاشرے کے نمائندے ہیں۔[۲۶]

مغربی جدیدیت کے آنے سے پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش، روبہ زوال تہذیبی عمل اور دولت مند طبقات کی اخلاقی و ذہنی پستی کے خوبصورت مرقعے اس ناول میں ملتے ہیں۔ حیدرآباد کی اس تہذیب کا المیہ یہ ہے کہ یہ نہ تو پوری طرح مشرقی اقدار کو چھوڑ پائی ہے اور نہ ہی مکمل مغربیت کا لبادہ پہن سکی ہے۔ گویا ریاست میں ہونے والی سماجی و معاشرتی تبدیلیاں سماجی خلفشار کا باعث بن رہی ہیں۔ عزیزاحمد نے رؤسا اور اشرافیہ طبقات کی ذہنی حالت کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر شہر کے کچھ رئیس تاش کھیل رہے اور ریڈیو پر کچھ لوگ پاک و ہند کی تقسیم کی تفصیل سن رہے ہیں، یہاں انھوں نے اس تاریخی عمل کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستان میں صدیوں سے جاری ہے اور متوسط اور نچلے طبقات کی تقدیر جس کا نشانہ ہے:

''کیا ہوا؟ دیوان بہادر نے اُن بیوقوفوں میں سے ایک سے پوچھا جو ہال سے ریڈیو سنتے سنتے باہر آ گیا تھا۔''تقسیم۔کٹا چھٹا پاکستان۔''

''بنگال اور پنجاب بھی تقسیم ہوگئے'' ایک اور نے اطلاع دی۔

''چلو اچھا ہوا۔'' دیوان بہادر نے اطمینان سے کہا اور پھر اپنے پتوں کی طرف دیکھ کر کہا ''نو پڈ'' پھر بُرج ہوتا رہا''

''لاہور کدھر گیا۔'' کسی نے کسی اور سے پوچھا۔

''فی الحال تو اُدھر ہی ہے،مگر اصلی تصفیہ حدود کا کمیشن کرے گا۔'' کسی نے کسی کو جواب دیا۔

برج ہوتا رہا۔ لاہور کہیں جائے چاہے جتنی تقسیم درتقسیم ہو۔ دیوان بہادر اورآرائش جنگ کو معلوم تھا کہ نظم و نسق انہیں کے ہاتھ میں رہے گا۔ وہی بلائے جائیں گے۔[۲۷]

گویا ان ذی جاہ اور صاحب اقتدار لوگوں کو تقسیم کے اس معاملے سے کوئی غرض نہیں البتہ وہ تاریخ کے اس ناگزیر عمل سے آشنا ہیں کہ حکومت تو بہر حال انھیں ہی کرنی ہے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ان کے مفادات ہر صورت میں محفوظ رہیں گے۔ اخلاقی زبوں حالی میں یہ طبقہ مغرب پرست ہے اور قدیم جاگیردارانہ تمدن کو بھی باقی رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں عوامل ان کے مفادات کو تحفظ دینے والے ہیں۔یہی ذہنی انحطاط ہے جو اس سیاسی شعور کے راستے میں مزاحم ہے جو آنے والی تبدیلی کی چاپ سن سکے۔ البتہ تاریخی عمل سے اخذ نتائج سے وہ آگاہ ہیں کہ حکومت بنانے کے لیے خدمات انہی کی حاصل کی جائیں گی۔

عزیزاحمد اس تاریخی شعور سے بھی آشنا ہیں جو زرعی ہندوستان میں سست رفتار تبدیلی کا باعث رہا ہے اور سماجی سطح پر ان طبقات کا بھی شعور رکھتے ہیں جو درآنے والی تبدیلی میں مزاحم ہیں۔عزیزاحمد بعدازاں جس مسلم ثقافتی شعور کی طرف لوٹ آئے تھے وہ ان کے ان ناولوں میں تقریباً ناپید ہے۔ اس کی زیادہ جامع وضاحت، جس سے عزیز احمد کے تہذیبی شعور کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں، ڈاکٹر فاروق عثمان نے ان الفاظ میں کی ہے:

> اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) مغربی تعلیم، قیام انگلستان اور پھر سب سے بڑھ کر ناول میں پریم چند کی سیکولر روایت نے انہیں مسلم ثقافتی شعور سے دور کر کے اشتراکی کل ہند قومیتی شعور سے زیادہ قریب کر دیا ہے۔[۲۸]

عزیزاحمد کے ناول اپنے عہد کی جامع نمائندگی کرتے ہیں ۔اس عہد کے خلفشار کو سلجھانے کی سنجیدگی اور انتشار کی عکاسی ان کا خاصہ ہے وہ کرداروں کی داخلی و خارجی زندگیوں کو بھرپور معنویت سے پیش کرتے ہیں۔تہذیبی پس منظر اور حقیقی سماجی حالت کو پیش کر کے عزیزاحمد نے اپنے ناولوں کو اپنے عصر کی تاریخ بنا دیا ہے۔

''ہوس'' کا موضوع تھا عورت کی المناک صورتحال، استحصال اور پردے کی مشرقی روایت جس نے عورت کو مزید

بے دست و پا کر دیا تھا جبکہ ''مرمر اور خون'' کا بنیادی موضوع غربت ہے۔ جنسی ہوس اور ناآسودگی دونوں ناولوں کے معیار متاثر کرتی ہے۔ ''گریز'' میں عزیز احمد نے نعیم کے حوالے سے مشرق اور مغرب کی تہذیبی و معاشرتی صورتحال کی تقابلی عکاسی کی ہے۔ جبکہ ''آگ'' میں کشمیر کی پسماندگی کو موضوع بنایا ہے جو دنیا بھر میں آنے والی تبدیلیوں سے بے خبر استحصال کا شکار ہو رہا ہے۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' دکن کی زوال آمادہ معاشرت کی عکاسی ہے۔ ناول کے تمام کردار بظاہر آسودہ اور مطمئن معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ ان کی ظاہری کیفیت ہے۔ تمام کردار کسی محرومی کا شکار ہیں، کسی کرب سے گذر رہے ہیں۔ ان کی روح بحران سے بچ نکلنا چاہتی ہے مگر بحران کا شکار ہے۔ دراصل وہ پورا معاشرہ ہی بحران کا شکار ہے جو کیسی شاندار بلندی رکھتا تھا مگر اب ایسی پستی رکھتا ہے۔

ترقی پسند ناول نگاروں نے زندگی کے ایسے موضوعات کو چنا جو اس سے قبل ممنوع تھے۔ طبقاتی کشمکش، صنفی امتیاز، سماجی استحصال، تہذیبی خلفشار، احساس غلامی، سامراجی جبر، اشتراکی نظریات پر مبنی مساوات کے حامل سماج کا خواب بالعموم ان کا موضوع تھے۔ ترقی پسند ناول نگار بالعموم اپنے عصری شعور کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے عصر کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو ناول میں نفسیاتی دروں بینی کا اظہار بھی خوب ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدا کی ہیجان خیزی اور اس کے انسانی داخل میں مرتب اثرات بھی ناول نگاروں کا موضوع بنے لیکن جنسی موضوعات کا چرچا زیادہ رہا ہے۔ البتہ اردو ناول کا یہ دور درست معنوں میں حقیقت نگاری کا دور ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۳۰۳

۲۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، ص ۲۶۰

۳۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص ۱۱۵

۴۔ سہیل بخاری، ناول نگاری۔ اردو ناول کی تاریخ و تنقید، ص ۲۵۲

۵۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، نیا ادارہ، لاہور، طبع چہارم، ۱۹۷۴ء، ص ۱۰

۶۔ سید علی حیدر، ڈاکٹر، اردو ناول: سمت و رفتار، شبستان، شاہ گنج، الہ آباد، ۱۹۷۹ء، ص ۱۵۴

۷۔ سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۶۷، ۶۸

۸۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت، ص ۲۶۳

۹۔ عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ص ۱۸۹

۱۰۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ادبی تخلیق اور ناول، مکتبہ اسلوب، کراچی، طبع اول، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۸

۱۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ادبی تخلیق اور ناول،ص۱۷۸

۱۲۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول،ص۳۱

۱۳۔ جگدیش چندر ودھاون، کرشن چندر: شخصیت اور فن، نگار شات، لاہور،۱۹۹۳ء،ص ۶۱۱

۱۴۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول،ص۳۲

۱۵۔ کرشن چندر، شکست، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد،۲۰۰۲ء،ص۵۵

۱۶۔ اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر، کرشن چندر کی ناول نگاری، ناشر: ازخود مصنف بہ تعاون مہاراشٹرا اردو اکادمی (انڈیا)، طبع دوم، ۲۰۰۷ء،ص ۱۶، ۱۷

۱۷۔ یوسف سرست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص ۳۷۸

۱۸۔ مجنوں گورکھپوری، نکات مجنوں، کتابستان، الہ آباد، باراول، ۱۹۵۷ء،ص۳۲۵

۱۹۔ سید وقار عظیم، داستان سے افسانے تک،ص۱۲۵

۲۰۔ یوسف سرست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص ۳۴۵

۲۔ یوسف سرست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص ۳۴۷، ۲۴۸

۲۲۔ عزیز احمد، گریز،ص۲۴۹

۲۴۔ عزیز احمد، آگ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء،ص۸

۲۵۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول،ص۳۷۳

۲۶۔ عبدالسلام، ڈاکٹر، اردو ناول بیسویں صدی میں،ص۴۸۲

۲۷۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، مکتبہ جدید، لاہور، طبع اول،۱۹۸۴ء،ص۲۵۶

۲۸۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، اردو ناول میں مسلم ثقافت،ص ۲۷۷